Urdu Research Journal Tashkeel ISSN (Online): 3007-3294, ISSN (Print): 3007-3286
Article Received: 18-03-2026 / Accepted: 28-06-2026 / Published: 30-06-2026
https://creativecommons.org/licenses/by-nc/4.0/
Doi: https://doi.org/10.66457/tashkeel.v4i1.65

عابدہ نذیر

ایم ایس سی، ایجوکیشنل لیڈرشپ اینڈ مینیجمنٹ، سکول آف ایجوکیشن، زبان ولسانیات، یونیورسٹی آف پورٹس ماؤتھ، یوکے

معاصر اُردو افسانے میں اطفال کے جنسی استحصال کی پیش کش

Abda Nazir
M.Sc. Educational Leadership and Management, School of Education, Languages and Linguistics, University of Portsmouth, UK
Email: abda.waheed54321@gmail.com
ORCID: https://orcid.org/0009-0005-3220-8767

The Representation of Child Sexual Abuse in Contemporary Urdu Short Stories

ABSTRACT
This study examines the representation of child sexual abuse in contemporary Urdu fiction, focusing on its social, psychological, and literary dimensions. Contemporary Urdu short stories have increasingly addressed child sexual abuse as a serious social issue rooted in power structures, class disparities, familial neglect, and cultural silence. Through the analysis of selected works by writers such as Shoaib Khaliq, Maryam Majeed Dar, Hamza Hassan Sheikh, and others, the study explores how fiction portrays the experiences of victims, the psychology of offenders, and the societal mechanisms that enable abuse. Drawing upon psychological theories, including Trauma Theory, Attachment Theory, and Social Learning Theory, the article highlights the long-term emotional and psychological consequences of abuse on children. It further argues that Urdu fiction serves not only as a medium of artistic expression but also as a tool for social awareness and critique. The study concludes that contemporary Urdu fiction plays a significant role in exposing hidden realities and promoting collective responsibility for child protection.
Keywords: *Child Sexual Abuse, Contemporary Urdu Fiction, Psychological Trauma, Sexual Exploitation, Child Protection, Social Awareness*

جدید اُردو افسانہ معاشرتی، نفسیاتی اور فلسفیانہ موضوعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس میں انسانی تجربات کے پیچیدہ مسائل کو بہت باریکی سے پیش کیا گیا ہے۔ جدید افسانے میں جنسی استحصال، خاص طور پر بچوں کے جنسی استحصال

کے موضوع کو ایک سماجی حقیقت سے تعبیر کیا گیا ہے کیوں کہ یہ استحصال کسی فرد واحد کا جرم ہی نہیں بلکہ ایک سماجی، ثقافتی اور اجتماعی نفسیات کا مسئلہ ہے۔ جدید اُردو افسانے میں بچوں کے جنسی استحصال کے موضوعات کی پیش کش اس حقیقت کی غماز ہے کہ یہ مسئلہ محض روایتی یا مخصوص طبقات تک ہی محدود نہیں بل کہ ایسے پیچیدہ اور ہمہ گیر مسائل کو جنم دیتا ہے جو معاشرتی و سماجی ناہمواریوں، طاقت کے عدم توازن اور خاندانی و سماجی ڈھانچے کی کمزوریوں سے وابستہ ہیں۔ جدید افسانے میں ان سوالات کا پیدا ہونا بالکل ایک فطری عمل ہے کہ کس طرح گھر کا ماحول اور سماجی بندھن نہ صرف بچوں کے جنسی استحصال کو تقویت دیتے ہیں بل کہ بعض مرتبہ ان جرائم کی پشت پناہی بھی کرتے ہیں۔ جدید اردو افسانے میں ایسے موضوعات کی موجودگی دراصل سماجی شعور کے ارتقاع کی ترجمان ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں اُردو افسانہ زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں کرداروں کی نفسیاتی گہرائیوں کو چھونے لگا جہاں انسانی محسوسات کو جذباتی یا المیاتی انداز میں بیان کرنے کی بجائے ان کے پس پردہ محرکات تک پہنچنے کی کوشش کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ نفسیاتی حقیقت نگاری کے زیرِ اثر تخلیق کردہ کردار اور کہانیاں معاشرے میں ہونے والی اجتماعی معاشرتی نفسیاتی پرتوں کو نمایاں کرتی ہیں۔

مثال کے طور پر کئی افسانوں میں بچوں کا جنسی استحصال اس طرح دکھایا گیا ہے کہ جسے پڑھ کر انسانی روح لرز جاتی ہے۔ اول یہ کہ بچوں کا جنسی استحصال کرنے والے کردار ان کی نفسیات میں خوف کا عنصر پیدا کر دیتے ہیں تا کہ متاثرہ بچے کسی سے اس واقعہ کا ذکر نہ کر سکیں۔ اور بعض اوقات انہیں مختلف طریقوں سے بہلا پھسلا کر ان کا اعتماد حاصل کر لیتے ہیں۔ یا پھر انہیں کسی تحفے کا لالچ دے کر ان کو اپنے قریب لانے کے بعد ان کے ساتھ جنسی زیادتی کرتے ہیں۔ اگر کوئی بچہ اپنے ساتھ ہونے والے جنسی استحصال کا ذکر کر بھی دے تو اہل خانہ اس بات کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کا سبب معاشرے میں بدنامی کا خوف ہوتا ہے۔ اس سارے معاملے میں المیہ یہ ہے واقعے کی غیر جانبدارانہ چھان بین کے بجائے اس بات کو چھپا کر ایک ایسے جرم کو تقویت دیتے ہیں جس کے نتائج بچوں کی شخصیت پر انتہائی منفی اثرات ڈالتے ہیں۔ یوں معاشرے کی اجتماعی نفسیات کو ظلم پر خاموش رہنے کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے عزیز احمد اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "جنسی مضامین میں تفصیلی حقیقت نگاری نہ سائنسی اہمیت رکھتی ہے، نہ ادبی، جنس کی تفصیلی حقیقت نگاری کا مقصد محض شہوانی ہو سکتا ہے، شہوانیت کا تجاوز قوم کے قوائے عمل پر برا اثر کرتا ہے۔ اول ہی رکاوٹوں اور پابندیوں کی وجہ سے ہندوستان میں جنسی رجحان ضرورت سے زیادہ ہے، شہوانی ادب سے یہ رجحان اور زیادہ پستی، اور زیادہ رجعت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔"[(1)]

بچوں کے استحصال کا موضوع صرف اردو افسانے کا نہیں بلکہ عالمی ادب کی متعدد اصناف میں اس کو برتا جا رہا ہے۔ اس لیے سماجی سطح پر موجود تضاد، اخلاقی سطح پر موجود دوہرے معیار اور قانونی کمزوریوں کو بے نقاب کرنا موجودہ افسانے کی سب سے اہم پیش رفت ہے جدید اُردو افسانہ زندگی کے ان پہلوؤں سے پردہ اٹھاتا ہے جنھیں سماج اکثر اپنی نام نہاد ساخت کی روایتی بقا کی وجہ سے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بچوں کا جنسی استحصال کا شکار ہونا بھی ایسی ہی ایک تلخ و تاریک حقیقت ہے جسے جدید افسانہ نگاروں نے انتہائی باریکی اور جرأت سے اپنی تحریروں میں سمویا ہے۔ شعیب خالق، مریم مجید ڈار، طاہرہ اقبال، نیلوفر اقبال اور نیر عباس علوی جیسے افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو نہ صرف المیہ کے طور پر پیش کیا بل کہ ان سماجی اور معاشرتی محرکات تک پہنچنے کی کوشش کی جو ان جرائم کو جنم دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں استحصال کے بیانیے سے واضح ہوتا ہے یہ کسی ایک فرد کا جرم نہیں بل کہ ایک روندے ہوئے معاشرے کی کچلی ہوئی نفسیات کا آئینہ ہے جہاں طاقت، خوف اور خاموشی جرم کو مسلسل بڑھاوا دیتی ہے۔ ظفر احمد لکھتے ہیں:

> "جدید اُردو افسانہ نفسیاتی گہرائی میں اتر کر انسانی ذہن کے ان گوشوں کو اُجاگر کرتا ہے جہاں خوف، احساسِ جرم اور دبی ہوئی خواہشات سانس لیتی ہیں۔ بچوں کے جنسی استحصال جیسے نازک موضوعات کو افسانہ نگار لاشعوری محرکات اور سماجی جبر کے پس منظر میں دیکھتے ہیں جہاں مجرم بھی اکثر کسی گہری نفسیاتی الجھن کا شکار ہوتا ہے۔ یہ کہانیاں صرف ظلم کی نشاندہی نہیں کرتیں بلکہ اس ذہنی پیچیدگی کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں جو ایک بگڑے ہوئے سماج میں پنپتی ہے"۔ (2)

جدید اُردو افسانے میں بچوں کے جنسی استحصال کو مختلف زاویوں سے بیان کیا گیا ہے تا کہ اس مظہر کے پس پردہ موجود پیچیدگیوں اور ان کی شدت کو زیادہ گہرائی کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ طاہرہ اقبال کے افسانے سماجی جبر و استحصال کے خلاف نہ صرف بلند خوانی کرتے ہیں بل کہ اس نظام کے بنیادی ڈھانچے کو بھی منہدم کر دیتے ہیں۔ اسی طرح شعیب خالق اور مریم مجید کے افسانے بھی ان محرکات کو سامنے لاتے ہیں جو معاشرے کے استحصالی رویوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ شعیب خالق لکھتے ہیں:

> "کھولی کی دیوار سے لٹکی لالٹین کی زرد روشنی کے ساتھ اگلا منظر دھندلاہٹ سے باہر نکلتا ہے۔ بیمار و لاچار باپ اور غمزدہ ماں، نڈھال جذبوں کی باتیں کر رہے ہیں۔ ایک طرف چارپائی پر گندی رضائی گٹھڑی کی صورت پڑی ہے اور اس میں چھوٹی بہن خود بھی گٹھڑی

بنی سوچکی ہے۔ "اللہ دوئے جہان چنگے کرے جعفر کے، اس نے اوروں کو بھی شہر نوکر کرایا
اور آپوں آپ ان کی تنخواہ گھر والوں کولا کر ہتھ میں پکڑا تا ہے۔ "(3)

بعض افسانوں میں اس موضوع کی پیش کش تجریدی انداز میں ہوئی ہے جہاں بیانیہ روایتی تسلسل میں نہیں بل کہ منتشر الخیال جذبوں اور محسوسات سے کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ نیر عباس علوی کے افسانے بھی اسی اسلوب کے عکاس ہیں جن میں متاثرہ کرداروں کی نفسیاتی کیفیات، خیال و خواب اور یادوں کے بکھراؤ سے ایسی کہانیاں جنم لیتی ہیں جن کا اثر محض الفاظ تک محدود نہیں رہتا بلکہ دل کو متاثر کرتا ہے۔ ان کی کہانیاں متاثرہ کردار کے نفسیاتی خوف میں مبتلا ہونے کے لامتناہی سلسلے کو قاری پر واضح کر دیتی ہیں جو ہمیشہ کے لیے قاری کے دماغ میں نقش ہو جاتا ہے۔ جدید افسانے کا ایک اہم عنصر سماجی آرکی ٹائپ ہے جہاں کردار انفراد کے بجائے سماج کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر معلم، مولوی، عزیز و اقارب یا قریبی دوست وغیرہ جیسے کرداروں کو عموماً اس طرح پیش کیا جاتا جو پورے سماجی نظام کے ترجمان ہیں اور اکثر اوقات ان مظالم کے خلاف آواز اٹھانے کے بجائے ان پر پردہ ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام کردار انفرادی رویے کے نہیں بل کہ ایک اخلاق سے عاری معاشرے کی مجموعی نفسیات کے عکاس ہیں۔

معصوم بچوں کا جنسی استحصال ایک ایسا جبر ناروا ہے جو ان کی پوری زندگی کو خوف کے اندھے کنویں میں دھکیل سکتا ہے جس کو ماہرین نفسیات نے مختلف طریقوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ جدید نفسیات اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ یہ ظلم جز وقتی ہوتا ہے لیکن اس کے نتائج کل وقتی ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے اطفال کے دماغ کو مفلوج کر سکتے ہیں۔ ایسا استحصال بچوں کی بری یاد بن جاتا ہے اور ان کے حال و استقبال کے فیصلوں پر گہرے نقوش چھوڑ سکتا ہے۔ اس ضمن میں شعیب خالق کے "درجِ ذیل" افسانے سے اقتباس پیش کیا جارہا ہے:

"اگر کوئی کچی عمر کا لڑکا اگلی سیٹ پر آ بیٹھتا تو سمندرے کے جسم میں ایک لذتی احساس جاگ اٹھتا اور وہ تانگے کے فرش پر لگی گھنٹی پاؤں سے دباتا تو جیسے اس کی مترنم خوشی پورے احاطے میں سنائی دیتی۔ ایسے میں اکثر کوئی تانگابان دور سے سمندرے کی اندرونی کیفیت جانتے ہوئے زور سے آواز دیتا۔ "سمندرے بچے مندرجہ زیل ای"؟ یہ سن کر جیسے اس کی گردن فخر سے اکڑ جاتی اور وہ ساتھ بیٹھی کم سن سواری کو مسکراتی آنکھوں سے ٹٹولتا احاطے سے باہر نکل جاتا"۔(4)

جنسی استحصال کے تجربے سے گزر کر بچے اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بے بس ہو جاتے ہیں اور یہ رویہ ان میں منفی جذبات پیدا کرتا ہے۔ ایسے بچے اکثر یا تو خود کو دنیا سے کاٹ لیتے ہیں یا ان کے

رویے میں شدید جارحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے قریبی رشتوں پر بھی اعتبار کرنا چھوڑ دیتے ہیں جس کے باعث وہ تنہا ہو جاتے ہیں اور ان میں سماجی تعلقات ترتیب دینے کی صلاحیت بھی دم توڑ دیتی ہے۔ اس جبر ناروا اور استحصال کے تجربے سے گزرے ہوئے بچوں میں دوسروں پر اعتماد کرنے کا مادہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اور انھیں عمر بھر لوگوں سے تعلق پر یقین رکھنے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شہزاد احمد لکھتے ہیں:

> "نفسیاتی عوارض بعض اوقات انسان کو ایسے رویوں کی طرف مائل کر دیتے ہیں جو سماجی اور اخلاقی اقدار سے متصادم ہوتے ہیں۔ جدید نفسیات، خاص طور پر فرائڈ اور ینگ کے نظریات یہ بتاتے ہیں کہ بچپن کے دبے ہوئے تجربات اور لاشعوری کشمکش بعض افراد میں غیر معمولی اور مجرمانہ رجحانات کو جنم دے سکتی ہے۔ بچوں کے جنسی استحصال میں ملوث افراد اکثر کسی گہری ذہنی پیچیدگی یا شخصیت کی بگاڑ کا شکار ہوتے ہیں، جسے محض سزا سے نہیں، بلکہ گہرے نفسیاتی مطالعے اور علاج سے سمجھنا ضروری ہے"۔[5]

اسی طرح سوشل لرننگ تھیوری (Social Learning Theory) کی رو سے تمام بچے قریبی ماحول میں سیکھتے ہیں۔ جس معاشرے میں ایسے جرائم کو چھپایا جاتا ہے تو وہاں بچوں میں ظلم پر آواز اٹھانے کے بجائے اسے سہنے کا رویہ پیدا ہو جاتا ہے یہ تھیوری یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ ظلم کو اگر بے نقاب نہ کیا جائے تو آئندہ نسلوں میں یہ رویہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اسے مقدر جان کر سر تسلیم خم ہو جاتی ہیں۔ اگر آپ کسی ایسے معاشرے کا حصہ ہیں جہاں بچوں کا تحفظ عدم توجہ کا شکار ہے تو در حقیقت آپ نے ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا ہے جس کی جڑوں تک زردی پھیل چکی ہے۔ بچے کسی معاشرے کے روشن مستقبل کی ضمانت کے امین ہوتے ہیں اور اس لیے ہمیں بچوں کی نشوونما میں شروع دن سے ان کا بھرپور خیال رکھنا چاہیے اگر ہم ایسا نہیں کریں تو ہمیں نسل در نسل اس بات کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا۔

کسی بھی معاشرے کے بے حس ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ اس میں موجود قانون ساز ادارے اور پالیسیاں بنانے والے بچوں کو ان جرائم سے تحفظ دینے میں بالکل ناکام ہو چکے ہوں۔ یہاں صرف حکومتی اداروں پر ہی یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی بلکہ ہر شخص کا انفرادی رویہ بھی اس ضمن میں بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اگر جھوٹی سماجی عزت، اور شان و شوکت کو بچانے کے عوض ان جرائم کی پردہ پوشی کی جائے تو یہ جرائم رکنے کا نام نہیں لیتے بل کہ ان میں مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ سعید اختر لکھتے ہیں:

> "نفسیاتی پیچیدگیاں بعض افراد کو اس حد تک گرا دیتی ہیں کہ وہ معصومیت پر حملہ کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ جدید نفسیات کے مطابق اینٹی سوشل پرسنیلٹی ڈس آرڈر اور پیڈوفیلیا جیسے عوارض ایسے جرائم کی جڑ میں موجود ہو سکتے ہیں۔ یہ مسائل صرف قانونی

نہیں بلکہ ذہنی اور جذباتی زوال کی علامت ہیں جہاں مجرم خود بھی کسی نہ کسی نفسیاتی الجھن،
ماضی کے صدمات یا شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو تا ہے۔ ایسے معاملات کو سمجھنے کے
لیے محض سزا نہیں بلکہ گہرے سائنسی اور نفسیاتی تجزیے کی ضرورت ہوتی ہے۔" (6)

جدید افسانہ نگاروں میں شعیب خالق کے افسانوں میں ایسے کئی کردار موجود ہیں جو معاشی مجبوریوں، طبقاتی تفریق اور سماجی بے حسی کا شکار ہیں۔ غربت ان کے افسانوں کا مرکزی کردار ہے۔ غربت اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم ایک ایسی سماجی بیماری ہے جو بچوں کو ہوٹلوں، فیکٹریوں اور ٹرانسپورٹ کمپنیوں میں کام کرنے پر مجبور کرتی ہے جہاں ان بچوں کا سب سے زیادہ جنسی استحصال ہوتا ہے اور وہ اس پر احتجاج تو کجا کسی کو بتا تک نہیں سکتے۔

اگر ان تمام جرائم پیشہ لوگوں کی ذاتی زندگیوں پر نظر دوڑائی جائے تو ان میں سے اکثر و بیشتر خود ذاتی طور پر ایسے بھیانک تجربات سے گزر چکے ہوتے ہیں۔ سائیکوڈینامک تھیوری کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ متاثر ہونے والے افراد ہمیشہ پوری زندگی ایسے صدموں سے ڈرتے رہتے ہیں اور پھر انتقاماً وہی تجربات دوسروں پر دہراتے رہتے ہیں اس جذبے کے اظہار کا سبب سماج کے خلاف ان کے دلوں میں پایا جانے والا غم و غصہ ہے، جو بعض مرتبہ ان کے قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ یہ افسانے ہمیں اس بات احساس دلاتے ہیں کہ ایسے واقعات ان جرائم کا نتیجہ ہوتے ہیں جو ہمارے معاشرے میں جنسی استحصال کے حوالے سے پیش آتے ہیں۔ اس سے نہ صرف معاشرے میں جرائم کو تقویت ملتی ہے بلکہ معاشرے میں بہت سے کردار ایک مجرم کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"جدید ترین افسانوں میں جو تجریدیت در آئی ہے اس کا مطالعہ بھی لاشعور کے حوالے سے
کیا جا سکتا ہے۔ اب افسانہ نگار خود کو واقعات کے فریم اور کرداروں کے افعال کا پابند نہیں
بناتا بلکہ ان سب سے آزاد ہو کر آزاد تلازمے سے خود کو دھیان کی لہروں پر آزاد چھوڑ دیتا
ہے۔ اس سے واقعات کو باہم پیوست کرنے کی کڑیاں ٹوٹتی جاتی ہیں۔"(7)

شعیب خالق کی کہانیوں میں وہ شعور موجود ہے جس کی بنا پر پڑھنے والے کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ معاشرے میں جرائم کے بڑھنے کے اصل محرکات کیا ہیں۔ ان کہانیوں سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی جرم کی روک تھام کے لیے صرف سزا و جزا کا تصور ہونا کافی نہیں بل کہ ایک ایک فرد کی تربیت کی بھی اشد ضرورت ہے۔ جنسی استحصال کے سلسلے میں افسانہ "ایک روپیہ روزانہ" سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"مگر پھر ایک رات بند دکان کے اندر لالٹین تو نہ تھی مگر بلب بجھا اور استاد نے شفیق کو پہلی
بار پنکچر لگانے کا درس دیا اور پھر ہر رات پنکچر کا خوف اسے ایک دن دکان سے بھگا لے گیا
اور جلد ہی گندگی کے ڈھیروں نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔"(8)

معاصر افسانہ نگاری میں بچوں کے جنسی استحصال کو سماجی سطح پر دیکھنے کے ساتھ ساتھ ایک وجودی بے چینی کے طور پر بھی دیکھا جانا چاہیے۔ سماجی علوم کی تحقیقات کے مطابق جنسی استحصال کا شکار ہونے والے بچے ایسے خوف اور ڈر کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کے باعث ان میں خود اعتمادی کا عنصر ختم ہو جاتا ہے اور وہ خوف کی وجہ سے چھپتے پھرتے ہیں۔ وہ زندگی بھر اس تکلیف دہ عمل سے گزرتے رہتے ہیں جسے سائیکوڈینامک تھیوری میں ریپٹیشن کمپلشن (Repetition Compulsion) کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں ایسے متاثرہ کردار دکھائے گئے ہیں جو اس ناخوشگوار واقعات کو اپنے ذہن میں رکھتے ہیں اور چاہتے ہوئے بھی بھلا نہیں سکتے۔ اس سلسلے میں مریم مجید کے ایک افسانے "چھوٹا گوشت" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "رفتہ رفتہ وہ ہر طرح کے ماس کا عادی ہو گیا مگر چھوٹے کی لذت سے وہ پہلی بار تب آشنا ہوا جب بھائی کی چھ سال کی بٹو کو ٹیکہ لگوانے لے گیا تھا۔ ننھی بٹو ٹیکے کے خوف سے کانپ رہی تھی اور اس کی گود میں سمٹ کر اس نے زور سے اس کا بازو دبوچ لیا تھا۔ بٹو کا لرزتا ہاتھ اسے سرور کی ایک نئی دنیا میں لے گیا۔ اس نے کمپوڈر سے دوا کی پرچی تھامی اور پلاسٹک کی بوتل والی لال دوا خریدتے ہوئے اس نے ایک چکنا محلول بھی خرید لیا۔ واپسی پر بٹو کا تاپ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ غریب کی ایسی حالت کچھ دو دن ہی رہی۔ پھر ماس ٹھنڈا پڑ گیا اور مٹی کی بھوک مٹانے قبرستان میں جا پہنچا۔ مٹی کو ٹھنڈے گرم سے فرق نہیں پڑتا۔"(9)

مریم مجید کے افسانوں کے حوالے سے رؤف احمد کی رائے دیکھیے:

> "مریم مجید ڈار نے جدید اُردو افسانے میں ایسے موضوعات کو اپنایا ہے جو سماج کے پوشیدہ زخموں کو نمایاں کرتے ہیں۔ مریم مجید ڈار کے افسانوں میں حقیقت کا عنصر پایا جاتا ہے اور وہ گہرے نفسیاتی اور جذباتی احساسات سے بھی لبریز ہوتے ہیں۔ وہ انسانی رشتوں، نفسیاتی کشمکش اور معاشرتی ناہمواریوں کو اس طریقے سے بتاتی ہیں کہ پڑھنے والا کہانی کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے اور اس کی گہرائیوں میں بھی اترتا چلا جاتا ہے۔" (10)

مریم مجید ڈار کی کہانیوں میں ایسے مجرموں کی نفسیات کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو بچوں کا استحصال کرتے ہیں۔ وہ اینٹی سوشل پرسنالٹی ڈس آرڈر (ASPD) کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لیے انھیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا ہے کہ وہ کوئی غلط کام کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسے کام ایک روٹین کا حصّہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض افراد پیڈوفیلیا میں مبتلا ہوتے ہیں۔ شروع سے ان کی ذہنی تربیت کچھ اس طرح سے کر دی جاتی ہے کہ وہ غلط کو بھی صحیح تصور کرنے لگتے ہیں۔

محترمہ سمی درانی کے افسانے چھام چھاب میں پیڈوفیلیا کے ساتھ ساتھ اس بھیانک حقیقت کی تصویر کشی کی ہے جسے دنیا ڈارک ویب کے نام سے جانتی ہے ڈارک ویب (Dark Web) انٹرنیٹ کا ایک پوشیدہ حصہ ہے جو روایتی سرچ انجنز جیسے گوگل وغیرہ پر ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ اپنی سخت انکرپشن اور شناخت چھپانے کی صلاحیت کے باعث غیر قانونی سرگرمیوں کے لیے بدنام ہے۔ڈارک ویب درحقیقت ورلڈ وائیڈ ویب کا وہ حصہ ہے جسے عام براوزرز کے ذریعے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس تک رسائی کے لیے مخصوص براوزرز اور سوفٹ ویئرز درکار ہوتے ہیں۔ اس ویب میں صارفین اور ویب سائٹس دونوں کی شناخت مکمل طور پر خفیہ رہتی ہے، جس کا فائدہ اٹھا کر مجرمانہ سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں۔ غیر قانونی تجارت، ممنوعہ اشیاء کی خرید و فروخت، ہیکنگ ٹولز، اور غیر قانونی مواد کا تبادلہ کیا جاتا ہے۔ڈارک نیٹ غیر قانونی سرگرمی جیسے غیر قانونی تجارت، فورم اور پیڈوفائل اور دہشت گردوں کے لیے میڈیا ایکسچینج کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کے افسانے چھام چھاپ سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اپنے بیڈ روم پہنچ کر اس نے گڑیا کو بیڈ پہ بٹھا کے ہاتھ میں چاکلیٹ پکڑائی اور خود کمرے میں نصب کیمروں کی سیٹنگ فکس کرنے لگا۔ سر پہ لال اوڑھنی، ماتھے پہ بندیا اور ہونٹوں پہ سرخی لگائے گڑیا اس کو مکمل نظر انداز کیے چاکلیٹ کھانے میں مصروف تھی۔ کیمروں کی سیٹنگ سے مطمئن ہو کے وہ گڑیا کی جانب بڑھا اور کیمرے کی جانب اشارہ کر کے بولا۔ گڑیا جان، ادھر سلام تو کرو گڑیا نے معصومیت میں کیمرے کی جانب تکتے ہوئے اپنا مخصوص سیلوٹ کیا۔ پھر گڑیا کچھ کسمسائی، اس کو شان کا یوں سر سے لپٹی اوڑھنی اتارنا بالکل نہ بھایا۔ پھر جب اس کے ماتھی کی بندیا کی باری آئی تو وہ بول اٹھی۔ "نہ نہ چھاب" اور سمٹ کے پیچھے ہٹ گئی۔ جدید ترین کیمروں میں ان مناظر کی ریکارڈنگ جاری تھی۔ کیمرے چیختی چلاتی گڑیا اور شان کی بڑھتی ہوئی درندگی کی مسلسل ریکارڈنگ کر رہے تھے۔ ہر زاویے سے فلم بنتی رہی اور شان ہر طور سے گڑیا کو مسلتا رہا جو چیخ و پکار کے بعد شدت تکلیف سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ شان نے جلدی جلدی فلمیں بیگ میں ڈالیں۔ جن کو کل لندن میں اپنی "سیکرٹ سوسائٹی آف پیڈوفائل" کی خفیہ رسومات میں شرکت کے دوران ایک بونس فیچر کے طور پر پیش کرنا تھا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی برطانوی شہریت کے لیے وہاں پر موجود ایلیٹ ممبران اس کی ضرور مدد کریں گے۔"(11)

مشرف عالم ذوقی نے اپنے ناول "پوکے مان کی دنیا" میں صارفیت کے کلچر، ملٹی نیشنل کمپنیوں کی غیر ذمہ دارانہ روش جس میں منافع بخش کاروبار کی آڑ میں بچوں کی نفسیات کو روندا جا رہا ہے تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے ناول میں ایک

کردار جج ایک نوعمر بچے روی کنچن کی اپنی ہم عمر سونالی سے جنسی زیادتی کے کیس میں روی کنچن کی جگہ ان کمپنیوں اور سرمایہ دارانہ نظام کو ہی قصوروار گردانتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"روی کنچن بے قصور ہے اور پورے معاملے کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ایک چھوٹے سے پو کے مان کی غلطی کو نظر انداز کرنے میں ہی ہم سب کی بھلائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود کوئی نہ کوئی مجرم ضرور ہے اور جو مجرم ہے اسے سخت سے سخت سزا ملنی چاہیئے۔ اس لیے میں پورے ہوش وحواس میں یہ فیصلہ سناتا ہوں کہ تعزیرات ہند دفعہ ۳۰۲ کے تحت میں اس نئی ٹیکنالوجی، ملٹی نیشنل کمپنیز، کنزیومر ورلڈ اور گلوبلائیزیشن کو سزائے موت کا حکم دیتا ہوں۔ ہینگ ٹل ڈیتھ۔"[12]

بعض کہانیوں کے کردار غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور پیسے کمانے کی خاطر ہر وہ کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو جرائم کے زمرے میں آتا ہے۔ والدین کی معاشی بدحالی ان کے اس نہج پہ لے آتی ہے کہ وہ آسانی سے جرائم پیشہ افراد کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ طاہرہ اقبال اپنے افسانے "امیر زادی" میں ایک ایسی ہی صورتِ حال کو بیان کرتی ہیں جہاں ایک غریب بچی کا دکان دار کی طرف سے جسمانی استحصال کیا جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"بدذات جھوٹ بولتی ہے۔ یہ یہ یہ کیا ہے؟" "یہ کوئی پیسے ہیں"! تو تیرے خیال میں اور کیا ہے" دکان دار کے دونوں ہاتھ بری طرح پیسے بٹورنے لگے۔ "یہ تو میر اپنڈا ہے۔ پیسے تو کاکت کے ہوتے ہیں یا پھر چاندی کے۔"، "لیکن ترے پاس تو سارا ہی مال ہے۔ گٹھڑی سی بنی سارے سودے سمیٹے پھرتی ہے۔"[13]

بعض اوقات گھریلو ناچاقیاں بچوں کے اندر احساسِ کمتری کو جنم دیتی ہیں۔ والدین کی بلاوجہ کی لڑائیاں، گھریلو تشدد، والدین کی علیحدگی اور غربت و افلاس بچوں کو اس نہج پہ لا کھڑا کرتی ہیں جہاں وہ اجنبی لوگوں پر اعتماد کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ایسے واقعات رونما ہو پاتے ہیں۔ حمزہ حسن شیخ اپنے افسانے "رحیمو کی ریڑھی" میں لکھتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کی روزی روٹی اور ان کے بہتر مستقبل کے لیے بعض اوقات دن رات محنت کر کے کچھ پیسے جمع کرتے ہیں تاکہ آنے والے مشکل دنوں میں ان کے کام آسکیں مگر کئی بار ان کا مصرف کچھ اور ہی بن جاتا ہے۔ وہ اس افسانے میں ایک غریب خاندان کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

"پرانی دیواریں سیم زدہ ہو کر گر رہی تھیں جبکہ پرانی چھتیں ہر بارش کے بعد ٹپکتی تھیں۔ زندگی اس کے لیے آسان نہ تھی۔ زندگی میں پہلی بار بھوک اور پیاس سے چھٹکارے کے بعد اس کو اپنے خاندان اور گھر کی بہتری کے لیے سوچنے کا موقع ملا تھا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ اب قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی ہے اور اس کی زندگی میں بھی تبدیلی آنے

والی ہے۔ مرمت کے خیال نے اس کو کچھ لمحوں کے لیے خوش کر دیا پھر اُس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔" (14)

اس افسانے کے مرکزی کردار کی یہ خوشی اُس وقت ادھوری رہ جاتی ہے جب اس کے ساتھ جانے والے ننھے بچے پر ایک خاتون کا پالتو کتا حملہ کر دیتا ہے اور وہ اپنے بچے کے دفاع میں اس کتے کو مار دیتا ہے۔ اس کو کتے کے قتل کے مقدمہ میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور وہ تھوڑی بہت رقم جو اس نے اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے جمع کی تھی۔ اس مقدمہ پر خرچ ہو جاتی ہے۔ غریب خاندان کا ہمیشہ سے یہی المیہ رہا ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت کے لیے وقت بھی نہیں نکال پاتا۔ اس کا سارا وقت بچوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے میں صرف ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں بچے عدم توجہ کا شکار ہو کر معاشرے کے دوسرے افراد کا آسان ہدف بن جاتے ہیں۔

جدید افسانے میں ان بچوں کے جنسی استحصال کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جو غربت اور یتیمی کی وجہ بے سہارا ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر ان کا تعلق معاشرے کے ایسے نادار طبقے سے ہوتا ہے جہاں ان کی حفاظت کی ذمہ داری کوئی نہیں لیتا اور آخر کار وہ یتیم خانوں، پناہ گاہوں، مدرسوں اور خانقاہوں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ اپنی ہر بنیادی ضرورت کے لیے دوسروں کے محتاج ہو جاتے ہیں اور ان کے ناروا تقاضوں کے سامنے خود کو مجبور پاتے ہیں۔

جنسی استحصال کے حوالے سے لکھے گئے اُردو افسانوں کو ہم دو حصّوں میں آسانی کے ساتھ تقسیم کر سکتے ہیں۔ ان میں سے بعض افسانے حقیقت نگاری کے حوالے سے لکھے گئے ہیں جن میں اطفال کے جنسی استحصال کو براہ راست بیان کیا گیا ہے۔ اس طرز تحریر میں بات کے سچے پن کی کڑواہٹ کا ذائقہ موجود ہوتا ہے۔ افسانوں کی دوسری قسم میں مصنف حقیقت کو براہ راست بیان کے بجائے اشاروں اور کنایوں کی مدد سے کہانی کو ترتیب دیتا ہے۔ جس سے قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایسے واقعات معاشرے میں کیونکر پیش آتے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے اپنے افسانے "امیر زادی" میں ایک گھر کے مالک کو کام کرنے والی بچی کا جسمانی استحصال کرتے ہوئے دکھایا ہے جسے مالکن ایک کیک کھانے پر جسمانی تشدد کا نشانہ بناتی ہے اور مالکِ مکان اسے دلاسہ دینے کے بہانے اس کا جسمانی استحصال کرتا ہے:

"مسٹر شاہد اس کی چوٹوں کو سہلاتے رہے۔ پچکارتے رہے۔ شششکارتے رہے پیار کرتے رہے۔ پیار کے ردِ عمل کے طور پر وہ بس کھاتی رہی۔ اب اسے کیا معلوم کہ پیار کا دائرۂ عمل کہاں تک دراز اور کہاں تک محدود ہو سکتا ہے اور چوٹیں کون سی کسی ایک جگہ پر لگی تھیں، ہر کہیں تو تھیں۔" (15)

جنسی استحصال کا موضوع عالمی ادب کی کہانیوں میں بھی سامنے آیا ہے۔ اس بات کی تصدیق مغربی ادبیات میں گبریل گارشیا مارکیز، نبوکوف اور ٹونی موریسن جیسے ادیبوں کے ہاں بھی ملتی ہے۔ مثال کے طور پر نبوکوف کے ناول

"Lolita" میں ایک کمسن لڑکی کے ساتھ ایک بالغ شخص کی جنسی زیادتی دکھائی گئی ہے۔ یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ بچپن میں جنسی استحصال کا شکار ہونے والے افراد پوری زندگی کے لیے جارحانہ رویوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بالغ ہونے کے بعد بھی نفسیاتی مسائل سے دوچار رہتے ہیں۔ چونکہ جنسی استحصال جیسے واقعات ان کے ساتھ اس وقت پیش آتے ہیں جب وہ اپنی شناخت بنا رہے ہوتے ہیں اس لیے ایسے واقعات ان کی بنیادی شناخت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> "نفسیاتی تنقید میں نہ صرف سماجی ڈھانچے بلکہ کردار کے لاشعوری محرکات کو بھی پرکھا جاتا ہے۔ فرائڈ کے نظریۂ نفسیاتی تجزیہ کے مطابق، کردار کے اعمال اور رویے اس کے دبے ہوئے جذبات اور ماضی کے تجربات سے جڑے ہوتے ہیں۔ یہی داخلی کشمکش اور سماجی عوامل مل کر ادب میں کرداروں کی نفسیاتی ساخت کو تشکیل دیتے ہیں، جس سے کہانی کی تہہ در تہہ معنویت ابھر کر سامنے آتی ہے۔" (16)

شعیب خالق نے جنسی استحصال کے حوالے سے اپنے افسانوی مجموعے "چھتری نما کہانیاں" میں نہایت ڈرامائی انداز میں اطفال کے جنسی استحصال کے بیانیے کو واضح کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں درندگی اور معصومیت کے مابین تضاد کی صورتوں کو اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ علمِ نفسیات میں ایسی کیفیت کو پیڈوفیلک ڈس آرڈر کہتے ہیں جس میں بالغ انسان چھوٹے بچوں کے ساتھ جسمانی قربت میں ایک جنسی لذت یا خوشی محسوس کرتا ہے۔ شعیب خالق کے افسانے "مندرجہ ذیل" میں ایک ایسے کردار کی نشان دہی کی جا سکتی ہے :

> "اس بات کا سمندرے کو بھی علم نہیں تھا کہ جب کوئی لڑکا سواری جڑ کر اس کے ساتھ بیٹھتی ہے تو خوشی کسی بدمست گھوڑے کی طرح اس کے اندر کیوں دوڑنے لگتی ہے۔"(17)

اسی سے ملتے جلتے کردار کی عکاسی مریم مجید ڈار کے افسانے "چھوٹا گوشت" میں کی گئی ہے۔ افسانے کے ایک کردار کے بارے میں وہ لکھتی ہیں کہ:

> "اس کے منہ کو جیسے لہو لگ گیا تھا۔ اب چھوٹے کے سوا کچھ بھاتا ہی نہ تھا۔ بھوک اسے کاٹتی تھی مگر وہ تھرتھری اسے کسی شے میں مل کے ہی نہ دے رہی تھی۔"(18)

حمزہ حسن شیخ، شعیب خالق ، مریم مجید ڈار اور طاہرہ اقبال نے بچوں کے جنسی استحصال کے حوالے سے جو افسانے لکھے ہیں ان تمام تحریروں میں سماجی نفسیات کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں بتایا ہے کہ وہ کون سے محرکات ہیں جن کے باعث ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں اور ان کا سدباب کیسے ممکن ہے۔ ایسے واقعات کے حوالے

سے انھوں نے اس بات کو اہمیت دی ہے کہ تمام مجرم پیشہ ور نہیں ہوتے لیکن کبھی کبھار ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے جرم کا ارتقاب ہو تا ہے۔ ایسے واقعات کے نتیجے میں بچوں نفسیاتی صدمات سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ معاشرے سے اپنے تعلقات قائم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں اور یہ بات ان کی آئندہ زندگی میں معاشرے سے دوری کا باعث بنتی ہے۔ صدمہ کیا ہوتا ہے اس حوالے سے ناصر عباس نیر کی یہ رائے ملاحظہ کیجیے:

"فرائیڈ نے باہر اور اندر کے زخم میں فرق کیا اس کے مطابق جو لوگ محض جسمانی طور پر زخمی ہوئے وہ نیوروسس کا شکار ہونے سے محفوظ رہے، انہوں نے درد سہا صدمہ نہیں۔ یہ بات قابل فہم ہے۔ جسمانی زخم ایک حسیاتی حقیقت ہے، یعنی یہ زخم دکھائی دیتا ہے، اس کا درد برابر محسوس ہوتا ہے اور ہماری پوری توجہ چاہتا ہے، یعنی ہمیں تقسیم نہیں ہونے دیتا، اس لیے یہ مندمل ہو جاتا ہے، ذہن و دل پر کوئی خراش ڈالے بغیر لیکن جہاں چوٹ اندرونی طور پر لگی ہو، اس کا معاملہ بالکل الگ ہے۔ اندرونی چوٹ یعنی ذہن، دل، روح یا شعور ذات پر لگنے والا زخم ہی صدمہ ہے۔"(19)

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ جرم کرنے والا بہت سفاکی اور ہوشیاری کے ساتھ بچوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے جس میں بچے اپنی معصومیت کے سبب سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور شدید ترین صدمات سے گزرتے ہوئے۔ وہ ایسے صدمات کو بھول پاتے ہیں نہ یاد رکھ سکتے ہیں۔ ایسے صدمات ان سے کو د اعتمادی چھین لیتے ہیں یا پھر ان کے مزاج کو انتقامی نوعیت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں ایسے عناصر پر کڑی نظر رکھنی چاہیے تاکہ معصوم بچے کسی کی ہوس کا شکار نہ ہوں۔ تنویر سپرا کا ایک شعر ہے:

وقت سے پہلے ہوس کی آریاں جس پر چلیں
ایک پودا جو ابھی نوخیز تھا بن بُور تھا

مریم مجید ڈار اپنی تحریروں میں ایسے واقعات کو بڑی سمجھداری کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو افسانہ چھوٹا گوشت میں اس موضوع پر سنگین ترین جذباتی واقعات کو علامتوں کے ذریعے قاری کے ذہن میں پیوست کر دیا گیا ہے۔ افسانوں کو موثر بنانے میں مکالمے، مناظر اور کردار بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ تمام اجزاء کہانی کو اکائی بنانے میں اہم ہوتے ہیں۔ افسانے کا اختتام بھی ایک روایتی انداز میں ہونے کی بجائے تکنیکی طور پر کیا جاتا ہے تاکہ قاری بیان کردہ کہانی کے سحر میں گرفتار رہے۔ افسانے میں اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ بچوں کو باشعور بنا کر جنسی استحصال سے محفوظ رہنے کی ترغیب و تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔ ایسے مواقع پر جب ان کے پاس کوئی بھی

حفاظت کرنے والا نہ ہو تو وہ ایسی تدابیر اختیار کر سکیں کہ جن سے وہ مجرمانہ ذہن کے لوگوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکیں۔ ظفر احمد اس حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

"ادب صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ سماج کے رویوں کا آئینہ ہے۔ ایک ایسا سماج جہاں بچے عدم تحفظ کا شکار ہوں، وہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ یہ معصوم ذہن کل کے معمار ہیں، مگر جب ان کی بنیادی ضروریات ہی پوری نہ ہوں، تو وہ خواب کیسے دیکھیں؟ قوم کے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم بچوں کو تحفظ، تعلیم اور ایک بہتر زندگی فراہم کریں، ورنہ اندھیروں میں بھٹکنے والی نسل تیار ہو گی۔" (20)

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے قوانین اور ایکٹ بنائے جائیں جن کی روشنی میں جرائم پیشہ افراد سے باز پرس کی جا سکے۔ جرم ثابت ہونے پر اس کا فوری طور پر کوئی مناسب حل یا سزائیں بھی تجویز کی جا سکیں تا کہ متاثرہ فریق کو بروقت انصاف مہیا ہو سکے۔

بچوں کے تحفظ کے حوالے سے مختلف اوقات میں پاکستان میں قوانین بنائے گئے ہیں مگر ان قوانین پر عمل درآمد کا فقدان نظر آتا ہے۔ پاکستان میں چائلڈ پروٹیکشن اینڈ ویلفیئر ایکٹ، زینب رسپانس اینڈ ریکوری ایکٹ 2020ء جیسے قوانین موجود ہیں مگر ان میں پر عمل درآمد کی صورت حال کچھ تسلی بخش نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک قانون اگر بنا دیا گیا ہے تو اس پر عمل درآمد کرنے کے لیے بھی کوئی ایسا طریقہ کار بنا دیا جائے۔ اس لیے عامر نقوی لکھتے ہیں:

"بچوں کے جنسی استحصال کو روکنے کے لیے حکومت نے مختلف اقدامات کیے ہیں، جن میں سخت قوانین، آگاہی مہمات اور خصوصی ہیلپ لائنز کا قیام شامل ہے۔ بچوں کے تحفظ کے لیے سکولوں میں تربیتی پروگرام متعارف کروائے جا رہے ہیں تا کہ وہ خطرات کو پہچان سکیں اور اپنی حفاظت کر سکیں۔ مگر صرف قانون سازی کافی نہیں، سماج کو بھی اپنا کردار ادا کرنا ہو گا تا کہ معصوم ذہن کسی خوف یا ظلم کا شکار نہ ہوں"۔ (21)

مریم مجید ڈار، حمزہ حسن شیخ اور شعیب خالق کے افسانوں کا مفصل جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اطفال کے جنسی استحصال میں نہ صرف قریبی رشتہ دار اور قابل بھروسہ افراد شامل ہوتے ہیں بلکہ سماجی ساخت کے سبب پیشہ ورانہ مقامات پر کام کرنے والے افراد بھی اس جرم میں شریک ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر بچوں کے جنسی استحصال کے درج ذیل اسباب ہو سکتے ہیں۔

1۔ پاکستانی سماج میں سب سے بڑا مسئلہ غربت اور بے روزگاری کا ہے جس کی وجہ سے اطفال مجبور ہو کر جنسی استحصال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر غریب والدین اپنے بچوں کو بڑے شہروں میں امیر گھرانوں کے ہاں ملازم رکھواتے

ہیں اس کے بعد کافی عرصہ ان کی خیر خبر نہیں لے پاتے۔والدین کی نظروں سے اوجھل ہونے کے سبب ایسے بچے آسانی سے جنسی جرائم کا شکار ہو سکتے ہیں اور وہ نوکری کے کھو دینے کے خوف کی وجہ سے کسی کو بتا بھی نہیں سکتے۔

2۔ بعض بچوں کو اپنے گھروں میں ہی جنسی اور جسمانی تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو ان کو غیر محفوظ اور کمزور بنا دیتا ہے۔ اس سے ان کی کی نفسیات پر گہرا اثر پڑتا ہے اور وہ کسی بھی دوسرے شخص پر اعتبار نہیں کرتے اور نہ ہی کسی سے مدد مانگتے ہیں۔ کیونکہ ان کے اندر ایک خوف پیدا ہو جاتا ہے۔

3۔ معاشرے میں بچوں کے حوالے سے جنسی استحصال کی بڑھتی ہوئی شرح کی روک تھام کے لیے قوانین تو موجود ہیں لیکن ان کے نفاذ کی کوئی عملی صورت نظر نہیں آتی۔ جس سے جرائم پیشہ افراد کے اس عمل کو تقویت ملتی رہتی ہے۔

4۔ بعض بچے نفسیاتی مسائل اور ذہنی معذوری کا شکار ہوتے ہیں اور ان کو اتنا شعور نہیں ہوتا کہ انہیں جنسی زیادتی سے خود کو کیسے بچانا ہے۔ ایسی صورت میں بچوں کی حفاظت کے حوالے سے گھر کے تمام افراد کی ذمہ داری مذید بڑھ جاتی ہے۔

5۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مجرم کو اس کے جرم کی سزا نہیں دی جاتی۔ جس سے وہ پوری طرح بے خوف ہو جاتا ہے اور آئندہ بھی ایسے جرائم میں پیش پیش رہتا ہے۔

6۔ پاکستانی سماج میں بچوں کو جنس سے متعلق تعلیم دینے اور تربیت کرنے کا رواج معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح بچے بروقت ایسے رویوں کے خلاف احتجاج نہیں کر سکتے اس لیے ضروری ہے کہ بچوں کے لیے بنیادی اور ضروری جنسی تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے۔

7۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر ایسے مواد کی تشہیر پر کڑی گرفت ہونی چاہیئے جو آسانی سے بچوں کو دستیاب ہو جاتا ہے جس سے ان کی نفسیات پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

8۔ والدین کو بچوں کی تربیت کرتے ہوئے انہیں آس پاس کے افراد کے ایسے مشکوک رویوں کے بارے میں ضرور آگاہ کرنا چاہیے جو کسی بھی حادثے کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں۔

9۔ جنسی استحصال کا شکار ہونے والے بچوں کو مکمل قانونی تحفظ فراہم کیا جانا چاہیئے تا کہ ان کی انا کی تسکین کو ممکن بنایا جا سکے اور ان کی شخصیت پر مرتب ہونے والے منفی اثرات کو کم سے کم کیا جا سکے۔

10۔ معاصر ادیبوں، صحافتی تنظیموں اور حقوق اطفال کے اداروں کو بچوں کے حقوق کے حوالے سے اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے تا کہ ان کا مستقبل روشن اور تابناک بنایا جا سکے۔

حواشی وحوالہ جات

1۔عزیز احمد، ترقی پسند ادب، ادارہ اشاعت اردو، دکن 1945ء، ص37

2۔ظفر احمد، ادب کے نفسیاتی رویے، ماہ رنگ ادب، کراچی، 2000ء، ص82

3۔شعیب خالق، بسکٹ مشمولہ چھتری نما کہانیاں، رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، 2019ء، ص69

4۔شعیب خالق، مندرجہ ذیل مشمولہ چھتری نما کہانیاں، رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، 2019ء، ص38

5۔شہزاد احمد، دماغ کی صورت گری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2009ء، ص298

6۔سعید اختر، نفسیاتی مطالعہ، کاروان ادب پبلی کیشنز، لاہور، 2003ء، ص276

7۔سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، سنگ مجلس ترقی ادب، لاہور، 1986ء، ص283

8۔شعیب خالق، چھتری نما کہانیاں، ص143،

9۔مریم مجید ڈار، چھوٹا گوشت، مشمولہ سوچ زار، فکشن ہاؤس، کراچی، 2019ء، ص101

10۔رؤف احمد ملک، خواتین افسانہ نگار، مشمولہ، ادب رنگ، شمارہ12، الفقر ہاؤس، لاہور، 2005ء، ص231

11۔ سیمیں درانی، چھام چھاب، مشمولہ اجرا، سہ ماہی ادبی رسالہ، 18مارچ2015، ijrakarachi.wordpress.com

12۔ڈاکٹر سید عون ساجد نقوی، ڈاکٹر مجاہد عباس، ناول پو کے مان کی دنیا اور مابعد جدید صورتِ حال مشمولہ حرف و سخن، جلد6، شمارہ2، 2022ء، ص-213

13۔طاہرہ اقبال، امیر زادی مشمولہ ریخت، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، 2010ء، ص137

14۔حمزہ حسن شیخ، قیدی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2025، ص59

15۔طاہرہ اقبال، امیر زادی مشمولہ ریخت، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، 2010ء، ص136

16۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، سنگ مجلس ترقی ادب، لاہور، 1986ء، ص283

17۔شعیب خالق، مندرجہ ذیل مشمولہ چھتری نما کہانیاں، رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، 2019ء، ص40

18۔ مریم مجید ڈار، چھوٹا گوشت، مشمولہ سوچ زار، فکشن ہاؤس، کراچی، 2019ء، ص101

19۔ناصر عباس نیر، ڈاکٹر (مدیر)، اداریہ مشمولہ بنیاد، جلد16، لمز، لاہور۔☆☆

20۔ ظفر احمد، ادب کے نفسیاتی رویے، ماہ رنگ ادب، کراچی، 2000ء، ص82

21۔عامر نقوی، سماجیات: نیا تناظر، حصہ اول، مکتبہ دانیال لاہور، 2005ء، ص432

References in Roman Script:

1. Aziz Ahmad, Taraqqi Pasand Adab, Idara Isha'at-e-Urdu, Deccan, 1945, P. 37.
2. Zafar Ahmad, Adab ke Nafsiyati Rawayye, Mah Rang Adab, Karachi, 2000, P. 82.
3. Shoaib Khaliq, “Biscuit,” Mashmoolah Chhatri Numa Kahaniyan, Romail House of Publications, Rawalpindi, 2019, P. 69.
4. Shoaib Khaliq, “Mundarja Zail,” Mashmoolah Chhatri Numa Kahaniyan, Romail House of Publications, Rawalpindi, 2019, P. 38.
5. Shehzad Ahmad, Dimagh ki Soorat Gari, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2009, P. 298.
6. Saeed Akhtar, Nafsiyati Mutala'a, Karwan Adab Publications, Lahore, 2003, P. 276.
7. Saleem Akhtar, Dr., Nafsiyati Tanqeed, Sang Majlis Taraqqi-e-Adab, Lahore, 1986, P. 283.
8. Shoaib Khaliq, Chhatri Numa Kahaniyan, P. 143.
9. Maryam Majeed Dar, “Chhota Gosht,” Mashmoolah Soch Zar, Fiction House, Karachi, 2019, P. 101.
10. Rauf Ahmad Malik, “Khawateen Afsana Nigar,” Mashmoolah Adab Rang, Shumara 12, Al-Faqr House, Lahore, 2005, P. 231.
11. Sameen Durani, “Chham Chhaab,” Mashmoolah Ijra, Seh-Mahi Adabi Risalah, 18 March 2015, ijrakarachi.wordpress.com.
12. Syed Aoun Sajid Naqvi, Dr., and Mujahid Abbas, Dr., “Novel Po ke Man ki Duniya aur Maba'd Jadeed Surat-e-Hal,” Mashmoolah Harf-o-Sukhan, Vol. 6, No. 2, 2022, P. 213. https://harf-o-sukhan.com/index.php/Harf-o-sukhan/article/view/516
13. Tahira Iqbal, “Ameerzadi,” Mashmoolah Rekht, Dost Publications, Islamabad, 2010, P. 137.
14. Hamza Hassan Sheikh, Qaidi, National Book Foundation, Islamabad, 2025, P. 59.
15. Tahira Iqbal, “Ameerzadi,” Mashmoolah Rekht, Dost Publications, Islamabad, 2010, P. 136.
16. Saleem Akhtar, Dr., Nafsiyati Tanqeed, Sang Majlis Taraqqi-e-Adab, Lahore, 1986, P. 283.
17. Shoaib Khaliq, “Mundarja Zail,” Mashmoolah Chhatri Numa Kahaniyan, Romail House of Publications, Rawalpindi, 2019, P. 40.
18. Maryam Majeed Dar, “Chhota Gosht,” Mashmoolah Soch Zar, Fiction House, Karachi, 2019, P. 101.
19. Nasir Abbas Nayyar, Dr. (Mudir), “Idariya,” Mashmoolah Bunyad, Vol. 16, LUMS, Lahore.
20. Zafar Ahmad, Adab ke Nafsiyati Rawayye, Mah Rang Adab, Karachi, 2000, P. 82.
21. Aamir Naqvi, Samajiyat: Naya Tanazur, Hissa Awwal, Maktaba Daniyal, Lahore, 2005, P. 432.